ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

"مٹی کا دیا" کی سیاسی، سماجی اور مذہبی بنیادیں

SOCIO-POLITICAL & RELIGIOUS FOUNDATIONS OF "MATTI KA DIYA"

ڈاکٹر عرفان توحید
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر پروین کلو
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
صائمہ اقبال
لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract

Meerza Adeeb was a famous dramatist and a short-story writer who is considered to be among the greatest writers of fiction in history. His plays and short stories won him six prizes and awards from the Pakistan Writers' Guild. In his autobiography "Matti Ka Diya" being part of its beautiful diction and linguistic characteristics it also seems a complete culture & civilization of its age. On account of these artistic merits, the autobiography of Meerza Adeeb will continue to play a significant role in the trend of autobiographies in Urdu. He has also endeavored to imply the same basic technique while writing his autobiography.

Keywords: Autobiography, Social, Political, Religious, Traditions, Culture, Indo-Pak

کلیدی الفاظ: خودنوشت، سماجی، سیاسی، مذہبی، رسومات، ثقافت، ہندوپاک

خودنوشت "مٹی کا دیا" اپنے دل کش اسلوب اور لسانی صفات کے ساتھ اپنے عہد کی جیتی جاگتی تہذیب و ثقافت کی مکمل تصویر معلوم ہوتی ہے۔ انھی خصوصیات کی بدولت میرزا ادیب کی یہ داستانِ حیات، اردو آپ بیتیوں کی روایت میں ایک اہم کردار ادا کرتی رہے گی۔[1] مصنف آپ بیتی میں تاریخ اور سماج سے جڑے واقعات کو اپنے اندر سمو کر خود کو اظہار کا ایک نیا وسیلہ بناتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مرزا ادیب نے بھی آپ بیتی میں اسی بنیادی اصول کو استعمال کرنے کی بھرپور کاوش کی ہے۔[2]

اُردو کی معروف آپ بیتیوں میں شمار کی جانے والی میرزا ادیب کی داستانِ حیات ۱۹۸۱ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس سرگزشت کے کچھ حصے مختلف رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ان رسائل و جرائد میں "اردو ڈائجسٹ"، "قومی ڈائجسٹ" اور "ماہ نو" اہم ہیں۔ آپ بیتی کے آغاز میں مصنف اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ ان کے دادا میر زا غلام حسین عالم فاضل اور اثر و رسوخ کی حامل شخصیت تھے۔ آپ کے دادا افغانستان کے شہر قندھار سے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے لاہور آئے اور یہاں پر مستقل طور پر سکونت پزیر ہوئے تھے۔

مصنف نے آپ بیتی میں اپنے بچپن کے حالات کے ساتھ لاہور شہر کی سماجی صورت حال کو بھی مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ اس دور میں لاہور شہر کی اکثریتی آبادی ہندو تھی جبکہ مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہندوستان میں ان دنوں اکثریت اور اقلیت کے باوجود اقوام کے درمیان سیاسی، سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کا دور دورہ تھا۔ محرم کے مہینے میں اکثر مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی پانی اور دودھ کی سبیلیں لگاتے تھے، جہاں پر بغیر کسی مذہبی امتیاز کے لوگوں کو پانی، دودھ یا شربت مہیا کیا جاتا تھا۔ ہندو "دسہرے" کے موقع پر مسلمانوں کے ساتھ منٹو پارک میں راون کے بت کو مل کر آگ لگاتے تھے۔ راون کے بڑے بت میں بارود بھر دیا جاتا تھا جو آگ لگائے جانے پر دھماکوں کی آواز کے ساتھ پھٹنے لگتا تھا۔ دسہرے کے دوسرے دن سوانگ کی باری آتی تھی جنھیں ہندو "رام لیلا" کہتے تھے۔ ان میں رام کی زندگی کے مختلف واقعات کا سوانگ بھر کر جلوس نکالا جاتا تھا۔ ان دنوں ہندو دیوالی کا تہوار بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے۔ رات کے وقت ہر

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

طرف چراغاں کیا جاتا تھا۔ دیوالی کی رات ہندو لکشمی دیوی کے سواگت کے لیے خصوصی طور پر تیاری کیا کرتے تھے۔ میرزا ادیب کی خودنوشت کے بارے میں جیلانی کامران لکھتے ہیں:

"فن کی جو صورت اس کتاب "مٹی کا دیا" میں نظر آتی ہے وہ زندگی سے مشابہ ہے۔"(۳)

مصنف خودنوشت میں لاہور شہر کی سماجی صورت حال کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ اس دور میں موسمی تہوار "بسنت" جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ بسنت کے روز رنگ برنگی پتنگیں اڑائی جاتی تھیں۔ اہل لاہور باقاعدہ اس تہوار کی تیاری کیا کرتے تھے، خواتین بسنتی دوپٹے اور مختلف شوخ رنگوں کے لباس پہنتی تھیں۔ مہمانوں کو بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا اور ان کے لیے پکوان تیار کروائے جاتے تھے۔ میلہ چراغاں کی چہل پہل کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ میلہ چراغاں شالامار باغ کے اندر لگتا تھا لیکن بعد میں انتظامیہ نے میلہ منانے والوں کے لیے شالامار باغ کا دروازہ بند کر دیا، جس کی وجہ سے میلے کی رونق آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی تھی۔ لاہور کے مضافات سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں میلے میں شامل ہونے کے لیے آتے تھے۔ اہل پنجاب اس میلے کا اہتمام بڑی آب و تاب سے کیا کرتے تھے۔ میلہ چراغاں صرف لاہور کا ہی نہیں بل کہ پنجاب کے بڑے میلوں میں سے ایک اہم میلہ ہوا کرتا تھا۔ عیدین کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ ان دنوں رواج تھا کہ عید کے دن سویاں پکا کر تمام اہل محلہ میں بانٹ دی جاتی تھیں، غیر مسلم کی تخصیص بالکل نہیں تھی، سب میٹھے کی اس سوغات کو بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ان دنوں ہندو مسلم امن و سکون سے رہا کرتے تھے۔ ہندو روزانہ کی بنیاد پر صبح کے وقت اپنی خواتین کے ساتھ راوی میں اشنان کرنے کے لیے جاتے تھے، گویا صبح کے وقت سے ہی میلے جیسی صورت حال دکھائی دیتی تھی، ادھر ہندو اشنان کرنے نکلتے ادھر مسلمان فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے مساجد کا رُخ کرتے تھے۔ اس دور میں موری دروازے کے باہر ایک مخصوص قسم کا میلہ لگتا تھا جسے "قدموں کا میلہ" کہا جاتا تھا، اس میں جماعت کی صورت میں ڈھول کی تھاپ پر ناچنے اور گانے والے لوگ شامل ہوا کرتے تھے جو چھوٹے بچوں کو اُٹھا کر لوریاں دیتے تھے اور بچوں کے والدین خوش ہو کر انھیں پیسے دیتے تھے۔ پروفیسر محمد منور اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> """مٹی کا دیا" ایک فرد کی داستان حیات بھی ہے اور ایک عہد کی ثقافتی دستاویز بھی۔ ہماری تہذیب و معاشرت کے بہت سے ایسے پہلو اس میں نظر آتے ہیں جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ یہ آپ بیتی گویا کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے اور میرزا ادیب نے اپنی ذات کے حوالے سے پورے ایک دور کی مرقع نگاری کی ہے۔"(۴)

میرزا ادیب آپ بیتی میں ہندوستان کی سماجی صورت حال بیان کرنے کے ساتھ سیاسی منظر نامہ بھی پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سیاست کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سیاسی عوامل میں حصہ لینے سے حد درجہ اجتناب کرتے رہے، لیکن بالآخر کانگریس پارٹی کے عروج کے دور میں کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت کے بعد مصنف نے بھی آل انڈیا مسلم لیگ کی رکنیت حاصل کر لی تھی۔ تحریکِ خلافت کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ تحریک کے کارکن ان کے محلے میں چندہ اگاہنے کے لیے کبھی کبھار چکر لگایا کرتے تھے۔ ان کارکنان کی تقاریر میں پر درد اور پر اثر اشعار کے استعمال کی بدولت خواتین بڑھ چڑھ کر روپے پیسوں کے ساتھ اپنا زیور تک اتار کر چندے میں دے دیا کرتی تھیں۔ ان دنوں مسلمانانِ ہند کے دلوں میں ترک قوم کے لیے ایک فطری محبت اور لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تحریکِ خلافت کے دوران مسلم اکابرین کی مذہبی جذبات سے بھرپور تقاریر نے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ عداوتوں سے نکال کر اخوت اور بھائی چارے کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ خلافت کی تحریک کے دوران مصنف کو تین اہم سیاسی شخصیات بہت پسند تھیں۔ ان میں مصطفیٰ کمال، انور پاشا اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل ہیں۔ مصنف نے اپنی زندگی میں ہندوستان کی سیاست میں بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ میرزا ادیب مختلف تحاریک کے نشیب و فراز کی روداد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "میری زندگی پاک و ہند کی اس فضا میں بیتی ہے جس میں سیاست کی طوفان خیزی روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ نمک سازی کی تحریک میرے سامنے اُٹھی تھی۔ تحریک ترک موالات کے بھی کچھ مناظر میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے تھے اور یہ مناظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں زندہ ہیں۔ عدم

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

تشدد کی تحریک کا بھی میں ایک عینی شاہد ہوں۔ میرے سامنے متعدد تحریکیں اٹھیں اور ختم ہو گئیں۔ مولانا ظفر علی خان کی تحریک نیلی پوش، احرار اسلام کی تحریک سرخ پوش، مسجد شہید گنج کی تحریک، ہندوؤں کی شدھی کی تحریک، اہنسا کی تحریک۔"(۵)

لاہور کے سیاسی جلسے عموماً دِلّی اور موچی دروازے کے باغوں میں ہوا کرتے تھے۔ جلسے جلوسوں میں جن سیاسی قائدین کو بطور خاص تقاریر کے لیے مدعو کیا جاتا تھا، ان میں مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری، غازی عبد الرحمٰن، مولانا مظہر علی اظہر، چوہدری فضل حق، علامہ محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ کانگریس پارٹی کے جلسے اکثر موری دروازے کے باغوں میں ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مصنف نے جن سیاسی رہنماوں کی تقاریر کو متاثر کن پایا ان میں پنڈت مدن موہن، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ دنی چند، ڈاکٹر عالم اور ڈاکٹر راجندر پرشاد قابلِ ذکر ہیں۔ میرزا ادیب "شہید گنج مسجد" کی تحریک کے دنوں میں قائداعظم محمد علی جناح کی پرجوش تقریر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"حضرت قائداعظم کو تقریر کرتے ہوئے میں نے شاہی مسجد میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ نحیف و نزار ہی تھے مگر آواز... خدا کی پناہ... جیسے بادل گرج رہا ہے۔"(۶)

ترقی پسند تحریک کے بارے میں مصنف آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ اس انقلابی تحریک کا آغاز کیا گیا تھا۔ تحریک کے مخالفین کی سوچ یہ تھی کہ اپنے دور کے بڑے آمر ہٹلر اور مسولینی کے مخالف ایسی رائے عامہ ہموار کی جائے جو ان کی امن کے خلاف سرگرمیوں کو روک سکے اور امن کا پرچار بآسانی کیا جائے۔ دراصل یہ لوگ سیاسی میدانوں سے ادب کی دنیا میں وارد ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھیں ادبی تقاضوں سے زیادہ شناسائی نہیں تھی۔ ادب سے گہری آشنائی نہ ہونے کی بدولت یہ تحریک ادبی ہونے کی بجائے زیادہ سیاسی ہو گئی تھی۔ ادب کی خاصیت یہ ہے کہ جب سیاست، ادب میں داخل ہوتی ہے، تو سیاست کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور وہ ادب کا حصہ بن جایا کرتی ہے۔ اس عمل کے متضاد جب ادب کو سیاست کے سر پر سوار کر دیا جائے تو ادب اپنے تقاضوں کو مکمل طور پر نبھانے سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت حال کے موقع پر سیاسی لوگ ادبی تحریکوں میں شامل ہو کر انھیں ادبی کی بجائے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاست زدہ تحریکوں میں بدل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ ترقی پسند تحریک ہٹلر اور مسولینی کے جارحانہ عزائم کے ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، یہ ایک ٹھوس وجہ تھی لیکن اس کے علاوہ بھی اس تحریک کے کئی پہلو تھے۔ حکمرانوں کے آمرانہ نظریات اس تحریک کو وجود میں لانے کا ایک محرک بنے تھے لیکن صرف ایک ہی وجہ کو اس تحریک کی بنیاد سمجھ لینا بھی انصاف کی بات نہیں ہے۔

تحریکوں کا وجود میں آجانا ایک طویل مسلسل عمل ہے۔ کوئی بھی تحریک اچانک نہیں ابُھرتی بلکہ اس کے پیچھے انسانی جذبات و احساسات کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ داخلی اور خارجی سطحوں پر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے ادب میں غالب اور سرسیّد احمد خان روایت شکن اور عقلیت پسندی کے پرچارک تھے، جنھوں نے انسانی زندگی کے بارے میں سائنسی تدبر پر زور دیا تھا۔ قدیم روایات سے انحراف اور زندگی کے ہر شعبے میں عقلی استدلال کو اپنانے کے لیے عملی مساعی ترقی پسندیت کی بنیاد ثابت ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک کو ایک غیر ادبی اور سیاسی تحریک سمجھ لینا کسی خام خیالی سے کم نہیں ہے۔ یہ تحریک خالص ادبی تحریک تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر تحریک کی وابستگی ادب سے ہی ہوتی ہے کیونکہ ادب زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا ہے اور ہر شعبہ زندگی سے ادب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل ہم ادب کو زندگی سے اور زندگی کو ادب سے دور نہیں رکھ سکتے کیونکہ انسانوں کی زندگی بہت سی اکائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لیے ادب ہی بہتر انداز میں اقوام کی زندگی کی عکاسی کر سکتا ہے۔

میرزا ادیب ترقی پسند تحریک کے قائل تھے چونکہ مصنف ان دنوں ہندوستان کے صفِ اول کے ادبی مجلے کے مدیر تھے۔ اس لیے ایک تو انھیں ترقی پسند خیالات کے حامل ادیب حضرات کی فکر اور فہم سے خوب آشنائی تھے۔ دوسرا "ادب لطیف" سے وابستہ بہت سے لوگ ترقی پسند تحریک کے روح رواں سمجھتے جاتے تھے۔ ان جملہ وجوہات کی بنا پر مصنف ترقی پسند تحریک سے براہِ راست متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ادب لطیف نے ہر لحاظ سے اس تحریک کا خوب ساتھ دیا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب اس تحریک کی آل پاکستان کانفرنس منعقد کروائی گئی تو مصنف دو اہم وجوہات کی بنا پر اس کانفرنس کی تائید کرنے سے قاصر رہے۔ ایک تو قرار داد اس مفہوم کے تحت مرتب کی گئی تھی کہ پاکستان کے صوبوں میں بولی جانے والی زبانیں قومی زبان بننے کا حق رکھتی ہیں۔ مصنف کو اس

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

بات پر اختلاف تھا کہ اگر صوبائی زبانوں کو قومی قرار دے دیا گیا تو اُردو زبان پاکستان کے صوبہ جات کے درمیان رابطہ کو کیسے برقرار رکھ سکے گی۔ رابطہ کی زبان کے بغیر قومی سلامتی کو کیسے ممکن بنایا جاسکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ کے جلسے میں باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اُردو ہوگی۔ قائداعظم کی مدبرانہ سیاسی بصیرت نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ پاکستان کا قومی اتحاد، لسانی اتحاد کے بغیر زیادہ دیر تک ممکن نہیں بنایا جاسکتا۔ کانفرنس کی دوسری قرار داد رسائل و جرائد کے حوالے سے تھی۔ اس میں بطور خاص کہا گیا تھا کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رسائل و جرائد میں تحریک کے مخالف نظریات کے حامل ادیب حضرات کی تحریروں کو ہرگز نہ چھاپا جائے۔ مصنف کو اس قرار داد سے بھی اختلاف تھا اور آپ نہیں چاہتے تھے کہ مخالفین کی تحریروں کو محض فکر و آگہی کے تضادات کے سبب چھاپنے سے روک دیا جائے۔ مصنف نے بعد میں ترقی پسند تحریک کی مجلس عاملہ کو اپنی ذاتی آراء سے تحریری انداز میں آگاہ کیا تو دوسرے روز اخبارات میں باقاعدہ خبر چھپی کہ میرزا ادیب کو ترقی پسند تحریک سے نظریاتی اختلاف کے باعث نکال دیا گیا ہے۔ مصنف کو اس بات کا ادراک تھا کہ متذکرہ قرار دادیں قابل عمل نہیں ہیں یہ جلد ختم ہو کر رہیں گی، بعد میں آپ کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ان قرار دادوں کو ختم کر دیا گیا۔

میرزا ادیب بنیادی طور پر اس فکر کے حامی تھے کہ ہر قوم میں موجود ترقی پسندی کے نظریات دوسری اقوام کے تصورات سے یکسر مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر ملک کی تہذیب و ثقافت الگ پہچان کی حامل ہوتی ہے۔ پاکستانی ادیبوں کے پاس قلم کی طاقت قوم کی امانت ہے۔ پاکستانی تہذیب کی جڑیں اسلامی اقدار و روایات سے منسلک ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ہمارے ادیب حضرات کو جلد از جلد اس حقیقت کو تسلیم کر کے پاکستانی تہذیب و ثقافت کا تحفظ یقینی طور پر ممکن بنانا چاہیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد عمر رضا لکھتے ہیں:

> "میرزا ادیب بنیادی طور پر تخلیق کار تھے اس لیے انھوں نے "مٹی کا دیا" میں اپنے تخلیقی سفر پر بھی روشنی ڈالی ہے اپنی اس سرگزشت کو انھوں نے جس اسلوب و انداز میں بیان کیا ہے۔۔۔ اس خودنوشت میں میرزا ادیب کا عہد اور اس عہد میں جاری مختلف ادبی تحریکات ورجحانات اور دیگر سیاسی، سماجی اور تہذیبی و معاشرتی حالات و واقعات اپنے پورے وجود کے ساتھ نمایاں ہوگئے ہیں۔"(۷)

انجمن مصنّفین کے قیام کے بارے میں مصنف تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے رائٹرز گلڈ کی آغاز میں بہت مخالفت کی تھی۔ کیونکہ اس انجمن کے قیام پر بڑا اعتراض یہ لگایا گیا تھا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان ادیبوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنی حکمرانی اور اقتدار کو مزید تقویت اور طوالت بہم پہنچا سکیں۔ مصنف نے بعد میں گلڈ کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل اس وجہ سے کر لیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ انگریز حکومت نے بھی فورٹ ولیم کالج اُردو کی ترویج کے لیے نہیں بلکہ اپنے انگریز افسران کی استعداد کار کو مزید بہتر بنانے کے لیے ہندوستانی رعایا کی زبان سکھانے اور کاروبار حکومت کو موثر طریقہ کار سے چلانے کے لیے قائم کیا تھا۔ مصنف کو بعد میں رائٹرز گلڈ کے اراکین سے میل ملاقات کا موقع ملا تو کچھ عرصہ کے بعد آپ باقاعدہ مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بن کر گلڈ میں اپنی خدمات بطریق احسن سرانجام دینے لگے اور ادیب حضرات کے مسائل حل کرانے کی کوششوں میں مصروفِ عمل رہے تھے۔ حالانکہ ادیبوں کے مسائل بڑھتے رہے لیکن انھوں نے حتی الامکان مصائب کو کم کرنے کی تگ و دو جاری رکھی۔ گلڈ کے متحرک کارکنان اور اراکین میں اشفاق احمد، میرزا ادیب، وقار عظیم، قتیل شفائی، ڈاکٹر وحید قریشی، حبیب کیفوی، محمد طفیل، ڈاکٹر رشید انور اور جمیل الدین عالی شامل تھے۔ خودنوشت کی ادبی حیثیت کے بارے میں ڈاکٹر بشیر سیفی رقم طراز ہیں:

> """مٹی کا دیا" میرزا ادیب کی خودنوشت ہی نہیں بلکہ ایک اہم ادبی دستاویز بھی ہے کہ اس میں اردو کے نامور اہل قلم کا تذکرہ بھی ہے اور قدیم لاہور کی دلچسپ مرقع نگاری بھی۔ چنانچہ اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں اسے ہمیشہ ایک منفرد مقام حاصل رہے گا۔"(۸)

میرزا ادیب آپ بیتی کے حصہ دوم کے آغاز میں اپنی خودنوشت کو تحریر کرنے کے مراحل اور اسباب کے بارے میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی دوسری تمام کتب کے بارے میں التزاماً مفصل انداز میں نہیں لکھ سکے کہ ان تصانیف کو کیوں اور کن حالات میں منصۂ شہود پر لایا گیا تھا۔ مصنف خصوصاً اپنی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

داستانِ حیات کو لکھنے کے اسباب پر اپنی خواہش کو دبا کر نہیں رکھ سکے تھے۔ خود نوشت کو تحریر کرنے کے پیچھے کار فرما اپنے جذبات اور احساسات کے بارے میں مصنف خامہ فرسا ہیں کہ ان کی یہ سر گزشت ان کی تحریر کردہ تمام تصانیف سے جدا اور مختلف ہے کیونکہ دوسری کتب افسانوی نثر یا تنقیدی مقالات پر مشتمل ہیں۔ اس بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ تحقیق و تنقید پر کتب لکھنے میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ایسی اصناف ادب کے متعلق بہت سی کتب شائع ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان کی نظر میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ جب کوئی ادیب اپنی داستانِ حیات کو خود صفحۂ قرطاس پر لے آئے۔ ڈاکٹر وہاج الدین اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "میرزا ادیب کی خود نوشت ان کے لیے اپنے حالات اور اس عہد کی ایسی تخلیقی دستاویز ہے۔ جس میں تاریخ اور ادب ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے جس اسلوب کو اپنایا ہے وہ پوری طرح افسانوی ہے۔ انھوں نے اپنی فنکارانہ مہارت سے حقیقت کو افسانوی تکنیک عطا کی لیکن حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرزا ادیب کی خود نوشت ان کی حیات کا فنی اور تخلیقی اظہار ہے۔"(۹)

مصنف کا ماننا ہے کہ کسی شخصیت کا اپنی زندگی میں اپنی داستان حیات کو چھپوا دینا ایک فساد انگیز کام ہے کیونکہ کسی ادیب کی کتب پڑھ کر قارئین کرام اس ادیب کے بارے میں اپنی ایک مخصوص رائے قائم کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اس مصنف کی خود نوشت میں اپنی رائے کے برعکس حالات و واقعات کو پڑھتے ہیں تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرزا ادیب کے ایک افسانوی مجموعے کا عنوان "حسرتِ تعمیر" ہے۔ ان افسانوں کے مختلف کرداروں میں ان افراد کی جھلک بہت نمایاں ہے، جنہیں مصنف نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ ان کرداروں کو تحریر کرتے ہوئے ایک دن مصنف کے ذہن میں ایک سوال اُبھرا کہ ان افسانوی کرداروں کے مشاہدات کو قلم بند کرنے والے کردار (میرزا ادیب) کی کہانی کو بھی منظر عام پر لایا جانا چاہیے۔ مصنف جب قلم لے کر اپنی آپ بیتی تحریر کرنے بیٹھے تو ان کی آنکھوں کے سامنے آن کی آن میں اپنے بچپن کے دو منزلہ مکان کی تصویر اُبھری، پھر بازاروں میں آوارہ گردی، کھیل کود کا زمانہ، پرائمری سکول کی تعلیم، اساتذہ کے کرخت چہرے، والدہ کی ایثار بھری مامتا، والد کا محرومیوں سے بھرا سخت لہجہ، احباب کا محبت آمیز سلوک، شباب کی منازل کے مشاہدات اور بھرپور ادبی سفر کے نشیب و فراز کی تصویر دکھائی دینے لگی۔ مصنف اپنی خود نوشت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> "مٹی کا دیا، میرزا ادیب سے زیادہ اس دلاور علی کی سوانح عمری ہے جو ۱۴/ اپریل ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ میرزا ادیب بننے تک اس شخص نے لاہور کی گلیوں، کوچوں، بازاروں، باغوں اور درس گاہوں میں جو جو کچھ دیکھا تھا، جو جو کچھ محسوس کیا تھا۔ جو جو خوشیاں غم حسرتیں اور خواب اس کے حصے میں آئے تھے۔۔۔ جس جس انداز سے اس نے اپنے روز و شب بتائے تھے... یہ سب کچھ بلا کم و کاست اس کتاب کے صفحات پر معرضِ تحریر میں آ گیا ہے۔"(۱۰)

مصنف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی بھی آپ بیتی تحریر کرنے والا اپنی زندگی کے تمام حالات و واقعات کو مکمل طور پر لکھنے سے قاصر رہتا ہے اور وہ اپنی داستانِ حیات میں صرف قابلِ ذکر قسم کے مشاہدات کو ہی سر گزشت کا حصہ بنا سکتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے اپنی خود نوشت لکھنے کا آغاز کیا تو انھیں ماضی کے اندھیرے راستوں پر یادوں کے کئی جگنو جا بجا چمکتے ہوئے دکھائی دیئے تھے مگر جب مصنف ان سب کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے تو کئی جگنو یک بارگی کے عالم میں چمک کر ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جایا کرتے تھے اور بہت سے جگنو بآسانی ان کے ہاتھ میں آ جاتے تھے۔ ان آسانی سے میسر آنے والے یادوں کے جگنوؤں کی روشنی میں مصنف نے اپنی یادداشتوں کو آپ بیتی کے صفحات کی زینت بنا دیا ہے۔ مصنف اپنی آپ بیتی کو نامکمل سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک علامہ محمد اقبال کے معروف شعر کے مصرعہ "کارِ جہاں دراز ہے" کے مصداق کارِ تخلیق کو کارِ جہاں کا حصہ خیال کرتے ہیں چونکہ کارِ جہاں بہت طویل ہے اور انسانی زندگی بہت قلیل ہے، اس لیے اضافہ جات کے باوجود ان کی داستان حیات ابھی تکمیل کے مراحل طے کرے گی، مگر تکمیل کی منزل حاصل نہیں کر سکے گی۔ آپ بیتی کے بارے میں مصنف اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.3 2021

"میں نے مٹی کا دیا اپنے پسینے اور لہو سے جلایا ہے اور مجھے پورا پورا اعتماد ہے کہ یہ دیر تک جلتا رہے گا۔ دیر تک اپنی روشنی بکھیرتا رہے گا۔ کیونکہ ایک دیا وہ مٹی ہی کا کیوں نہ ہو جب اس میں جگر کا لہو جلایا جاتا ہے تو اس کی لو وقت کے جھونکوں کے سامنے لرز تو سکتی ہے، کبھی بجھتی نہیں ہے۔"(۱۱)

میرزا ادیب لکھتے ہیں کہ آپ بیتیوں کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ اسے دنیا کا کوئی بھی انسان تحریر کر سکتا ہے شرط یہی ہے کہ اس میں دلچسپ امور بھی شامل ہوں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی خود نوشت لکھتے ہوئے آپ بیتی کی جملہ شرائط والی بات کا خیال اس لیے نہیں رکھا کیونکہ اگر وہ ان اصول وضوابط کی طرف زیادہ دھیان دیتے تو شاید ان کی آپ بیتی کبھی منصہ شہود پر نہ آسکتی۔ مصنف کے بقول ان کے قارئین سرگزشت میں اس انسان کی تلاش ضرور کریں گے جو اپنے آپ کو مٹی کا دیا کہتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ وہ خود بھی اسی انسان کے تعاقب میں ہیں، لیکن انھیں کبھی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مادی انسان بذات خود کسی سایہ میں تحلیل ہو چکا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اُردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۶۶
۲۔ وہاج الدین علوی، اردو خود نوشت : فن اور تجزیہ ، نئی دہلی : شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۹ء، ص:۲۴۸
۳۔ جیلانی کامران، مٹی کا دیا، مشمولہ، میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن، مرتبہ، رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص:۴۰۷
۴۔ جیلانی کامران، مٹی کا دیا، مشمولہ، میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن، ص:۴۲۴
۵۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۱۴
۶۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص:۴۰۹
۷۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب۔ فن اور روایت، ص:۱۶۶-۱۶۷
۸۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، مٹی کا دیا، مشمولہ، میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن، مرتبہ، رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص:۴۳۷
۹۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص:۴۲۲
۱۰۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص:۴۱۰
۱۱۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص:۲۱۸

ماخذ:

۱۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اُردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء
۲۔ وہاج الدین علوی، اردو خود نوشت : فن اور تجزیہ ، نئی دہلی : شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۹ء
۳۔ جیلانی کامران، مٹی کا دیا، مشمولہ، میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن، مرتبہ، رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء
۴۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۶ء
۵۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، مٹی کا دیا، مشمولہ، میرزا ادیب۔ شخصیت اور فن، مرتبہ، رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء